آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہوگی[۲۱] ــــــ اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔[۲۲] ان میں سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔[۲۳] کچھ چہرے اُس روز دمک رہے

ہر جنس کی نباتات کے لیے اس کے مناسبِ حال غذا بہم پہنچا کر اسے نشو و نما دے۔ یہ تخم اِن خاصیتوں کے ساتھ، اور زمین کی یہ بالائی تہیں اِن صلاحیتوں کے ساتھ خدا نے پیدا نہ کی ہوتیں تو کیا انسان کوئی غذا بھی یہاں پا سکتا تھا؟

۲۰ یعنی تمہارے ہی لیے نہیں بلکہ اُن جانوروں کے لیے بھی جن سے تم کو گوشت، چربی، دودھ، مکھن وغیرہ سامانِ خوراک حاصل ہوتا ہے اور جو تمہاری معیشت کے لیے بے شمار دوسری خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اسی لیے ہے کہ تم اِس سرو سامان سے مُتَمتِّع ہو اور جس خدا کے رزق پر پل رہے ہو اُسی سے کفر کرو؟

۲۱ مُراد ہے آخری نفخِ صور کی قیامت خیز آواز جس کے بلند ہوتے ہی تمام مرے ہوئے انسان جی اٹھیں گے۔

۲۲ اِس سے ملتا جلتا مضمون سُورۂ معارج آیات ۱۰ تا ۱۴ میں گزر چکا ہے۔ بھاگنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اِن عزیزوں کو، جو دنیا میں اُسے سب سے زیادہ پیارے تھے، مصیبت میں مبتلا دیکھ کر بجائے اِس کے کہ اُن کی مدد کو دوڑے، اُلٹا ان سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اسے مدد کے لیے پکار نہ بیٹھیں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں خدا سے بے خوف اور آخرت سے غافل ہو کر جس طرح یہ سب ایک دوسرے کی خاطر گناہ اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے رہے، اُس کے بُرے نتائج سامنے آتے دیکھ کر ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اپنی گمراہیوں اور گناہ گاریوں کی ذمہ داری اُس پر ڈالنے لگے۔ بھائی کو بھائی سے، اولاد کو ماں باپ سے، شوہر کو بیوی سے، اور ماں باپ کو اولاد سے خطرہ ہوگا کہ یہ کم بخت اب ہمارے خلاف مقدمے کے گواہ بننے والے ہیں۔

۲۳ احادیث میں مختلف طریقوں اور سندوں سے یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ہوں گے، ہشّاش بشّاش اور خوش و خرّم ہوں گے۔ اور کچھ چہروں پر اس روز خاک اُڑ رہی ہوگی اور کلونس
ع ا چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی کافر و فاجر لوگ ہوں گے ؏

نے فرمایا" قیامت کے روز سب لوگ ننگے بُچّے اٹھیں گے۔ آپ کی ازواجِ مطہرات میں سے کسی نے (بروایت بعض حضرت عائشہؓ نے، اور بروایتِ بعض حضرت سَودہؓ نے اور بروایتِ بعض ایک خاتون نے) گھبرا کر پوچھا یارسول اللہ کیا ہمارے ستر اُس روز سب کے سامنے کھُلے ہوں گے؟ حضورؐ نے یہی آیت تلاوت فرما کر بتایا کہ اُس روز کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا ہوش نہ ہوگا (نسائی، ترمذی، ابن ابی حاتم، ابن جریر، طَبرانی، ابن مَردُوْیہ، بَیْہَقی، حاکم)۔

فقر و فاقہ اور اُس کا اسلامی حل

یوسف القرضاوی
ترجمہ و تلخیص: عبد الحمید صدیقی

(۱)

زکوٰۃ — دنیا میں اوّلین اجتماعی کفالت | نظامِ زکوٰۃ اجتماعی کفالت کے معاملہ میں پہلی منظم قانون سازی ہے جو محض انفرادی اور رضاکارانہ طور پر دیئے جانے والے صدقات ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ باقاعدہ میعادی سرکاری امداد پر قائم ہے۔ ایسی امداد جس کا مقصد یہ ہے کہ ہر محتاج اور اس کے اہل و عیال کی خورد و نوش، لباس، رہائش اور زندگی کی دوسری تمام ضروریات بغیر اسراف اور کنجوسی سے کام لیے پوری ہو جائیں۔ اس امداد کا دائرہ صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ یہود و نصاریٰ میں سے بھی جو مسلمانوں کی حکومت کے زیرِ سایہ زندگی گزار رہے ہوں وہ بھی اگر محتاج ہوں تو اس امداد سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

یہی وہ اجتماعی کفالت (SOCIAL SECURITY) ہے جس کا تخیل مغربی دنیا میں اب پیدا ہوا ہے، مگر اب بھی اُن کی فکر اسلام کی پیش کردہ اجتماعی کفالت کے معیار تک نہیں پہنچ سکی جس میں ہر محتاج اور اس کے اہل و عیال کی مکمل کفالت کی ضمانت دی گئی ہے۔ نیز اُن کی فکر کا محرک للّٰہیت اور کمزوروں کے لیے رحم کا جذبہ نہیں ہے بلکہ مختلف انقلابات اور اشتمالیت اور اشتراکیت کی خوفناک لہروں اور دوسری عالمگیر جنگ، اور مغربی اقوام کی رضاجوئی کے جذبے نے انہیں اس اندازِ فکر پر مجبور کر دیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے مغربی حکومتوں کی طرف سے اجتماعی کفالت کا باقاعدہ اعلان ۱۹۴۱ء میں کیا گیا جب کہ انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اوقیانوسی معاہدے (میثاقِ اوقیانوس) میں اس بات پر اتفاق رائے کیا کہ ہماری حکومتوں کے اندر رہنے والے جملہ افراد کو اجتماعی کفالت کی یقین دہانی ہونی چاہیے۔ حالانکہ اسلام نے اِن مغربی حکومتوں سے صدیوں

پہلے ایک ایسا اجتماعی کفالت کا نظام قائم کیا ہے جو ایک دینی فریضہ ہے اور جس کے نفاذ کا انتظام اسلامی حکومت کرتی ہے اور بوقتِ ضرورت اغنیاء سے فقراء کے حقوق حاصل کرنے کے لیے جنگ کرتی ہے۔ اب ہمہ بعض مصنّفین اجتماعی کفالت کے نظام کے آغاز کا سہرا یورپ کے سر باندھتے ہیں اور ہماری تاریخ اور دینی ورثے کو بالکل درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے۔ عرب لیگ نے ۱۹۵۲ء میں دمشق میں دراساتِ اجتماعیہ (SOCIAL STUDIES) کا ایک حلقہ قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ مختلف اجتماعی کفالت کے نظاموں کا مطالعہ کرے۔ اس حلقے کے منتظم مسٹر دانیال سن جیرج نے اجتماعی کفالت کے ارتقاء کے بارے میں ایک لیکچر دیا جس میں انہوں نے فرمایا کہ "قرونِ گذشتہ میں فاقہ کشی کے عالم میں مر جانے سے نجات کے لیے محتاجوں اور فقراء کی اعانت و امداد کے لیے سرکاری تدابیر کی تاریخ کا آغاز سترھویں صدی سے ہوتا ہے جبکہ حکومت کے ابتدائی اقدامات نے یہ شکل اختیار کی کہ مختلف مقامی تنظیموں نے منظّم طور پر محتاجوں اور فقراء کی مدد کرنی شروع کر دی۔"

مسٹر دانیال کا مذکورۂ بالا بیان تاریخِ اسلام اور فریضۂ زکوٰۃ کی حقیقت سے ان کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ہم نے گذشتہ صفحات میں پوری طرح واضح کیا ہے کہ اسلام کا نظامِ زکوٰۃ ایک ایسا نظام ہے جس میں زکوٰۃ کے جمع و صرف کی ذمہ دار اسلامی حکومت ہوتی ہے۔ یہ انفرادی احسان یا رضا کارانہ صدقات کے قبیل سے نہیں ہے بلکہ محتاجوں کے لیے یہ اللہ کی طرف سے فرض کردہ مقررہ حق ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے والوں پر اس کا ادا کرنا واجب ہے۔ یہ عام حکومتوں کی طرف سے لگائے جانے والے ٹیکسوں سے یوں متمیّز ہے کہ یہ ایک دائمی اور مقررہ ٹیکس ہے۔ اگر حکومت اسے کبھی نظر انداز کر دے اور لوگوں سے وصول نہ کرے تو جب تک کہ مسلمان اپنے رب کی رضا، قلب و ضمیر کے تزکیہ اور اپنے مال کے پاک اور مطہر کرنے کے لیے اسے ادا نہ کر دے اس کا اسلام صحیح نہیں رہتا اور ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ یہ مسلمان پر فرض کیا گیا کہ وہ اسے بطیبِ خاطر نکال دے اور اسے لینے والے پر اپنا احسان نہ جتائے اور ایذا رسانی نہ کرے۔ اور محتاج اسے اس شان سے لے کہ لیتے وقت اُسے یہ معلوم ہو کہ اُسے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ زکوٰۃ اللہ کے اس مال میں اس کا حق ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض بندوں کو اپنا نائب مقرر فرمایا ہے۔ اور

مسلمانوں کی جماعت سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس مقرر و معلوم حق (زکوٰۃ) کی خاطر ان لوگوں سے جنگ کرے جو اسے ادا نہیں کرتے۔

مسٹر دانیال دورِ حاضر میں اجتماعی کفالت کی ماہیت و مزاج بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"جدید اجتماعی تکافل کے منصوبوں کی ما بہ الامتیاز خصوصیات زمانہ قدیم میں فقراء کی امداد و اعانت کی تدابیر کے مقابلے میں یہ ہیں کہ ان کا اطلاق صرف فقراء پر ہی نہیں ہوتا بلکہ کسی بھی گروہ یا طبقہ کے ہر اس شخص پر ہو سکتا ہے جس کے ذرائع آمدنی ایک مقررہ معیار سے کم ہوں۔ وہ بعض شرائط کے ساتھ اس امداد و اعانت کو فقراء کا ایک حق ماننے کے لیے تیار ہیں اور ان میں امداد کی ادائیگی کی مقررہ شرحیں اور عطا کرنے کے باقاعدہ طریقے ہیں۔ اس کے علاوہ اس اسکیم میں وہ ذلت و خواری نہیں ہے جو فقراء کو مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے میں برداشت کرنی پڑتی ہے، اور اس اسکیم نے شہری حقوق کے اس فقدان کا بھی خاتمہ کر دیا ہے جو فقراء کو صدقات دینے کے قدیم نظام میں پایا جاتا تھا۔"

مسٹر دانیال ان خصوصیات کو جدید اجتماعی تکافل کی امتیازی خصوصیات قرار دیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ماضی میں ان خصوصیات کا کوئی اجتماعی نظام نہ پایا جاتا تھا۔ یہ باتیں مغربی دنیا اور اس کی تاریخ کے بارے میں تو صحیح ہیں لیکن اگر مسلمانوں کی تاریخ کو بھی نگاہ میں رکھا جائے تو ان کا یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد ہے کیونکہ اجتماعی تکافل کی یہ ما بہ الامتیاز خصوصیات اسلام کے نظامِ زکوٰۃ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ گذشتہ صفحات میں ہم واضح کر آئے ہیں کہ اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کرتے ہوئے "حقِ معلوم" کہا ہے جس میں احسان جتانے اور ایذا رسانی کی کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمان حکومت اس کے جمع و صرف کی ذمّہ دار ہے۔ یہ ہر اس شخص پر خرچ کی جا سکتی ہے جس کا کوئی ذریعۂ آمدنی نہ ہو یا اگر ہو تو اس سے اتنی کم آمدنی ہوتی ہو کہ اس اور اس کے اہل و عیال کی ضروریات پوری نہ کر سکے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ اس کا مقصد فقراء کو غنی کر دینا اور فقراء و اغنیاء کے درمیان فرق و امتیاز کی خلیج کو پاٹنا ہے۔ جدید سوشل سکیورٹی کے علمبردار تو خواب میں بھی ان خصائص کا حامل اجتماعی نظام پیش نہیں کر سکتے۔

بیت المال کے دیگر ذرائع آمدنی پر غرباء کے حقوق گذشتہ صفحات میں ہم نے یہ واضح کیا ہے کہ اسلام میں فقر و فاقہ اور تنگ دستی کو دُور کرنے کے لیے زکوٰۃ ایک اہم مالی ذریعہ ہے۔ اب ہمیں اس میں اتنی بات کا اضافہ کر لینا چاہیے کہ بیت المال یعنی اسلامی حکومت کے خزانۂ عامرہ کے تمام مستقل ذرائع آمدنی میں فقر و فاقہ اور تنگ دستی کا علاج قدرِ مشترک ہے۔ اسلامی حکومت کی املاک اور وہ پبلک املاک و اموال جن کا انتظام و انصرام حکومت کرتی ہے اور جن کی آمدنیاں بیت المال میں جمع ہوتی ہیں ان کے صرف میں بھی یہ اصول لازماً پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ مال صرف دولت مندوں ہی میں چکر نہ لگاتا رہے بلکہ معاشرے کے تمام افراد میں اس کے منافع انصاف کے ساتھ تقسیم ہوں اور معاشرے کے مختلف عناصر کے درمیان اونچ نیچ کو ہموار کیا جائے۔ خصوصاً اگر زکوٰۃ اہلِ حاجت کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو رہی ہو تو حکومت کی دوسری تمام آمدنیوں سے ان کی حاجات پُوری کرنے کا کام لینا ہو گا۔

مالِ غنیمت کے خُمُس، خراج اور ہر قسم کے دیگر ٹیکسوں میں محتاجوں اور حاجت مندوں کا حق ہے۔ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (الانفال: ۴۱)

اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصّہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

مَآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰي رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ۔ (الحشر: ۷)

جو مال پھیر دیا ہے اللہ نے اپنے رسول کی طرف بستیوں کے لوگوں سے (یعنی فے) وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمہارے دولت مندوں کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے۔

فقہاء نے زکوٰۃ کے مال و متاع میں فقراء کے حقوق کے بارے میں حد درجہ احتیاط کی ہے۔ انہوں نے

اس بات کو جائز قرار نہیں دیا کہ مال زکوٰۃ کو مصالحِ عامہ مثلاً فوج کی تنخواہوں وغیرہ پر خرچ کیا جائے، البتہ اگر پبلک بجٹ میں کچھ کمی ہو اور زکوٰۃ کے بجٹ میں گنجائش ہو تو زکوٰۃ کے بجٹ سے قرض لے کر پبلک بجٹ کی کمی پوری کی جاسکتی ہے۔ پھر جب پبلک بجٹ میں گنجائش ہو تو زکوٰۃ کے بجٹ سے حاصل کردہ قرض چکا دیا جائیگا۔

اس ضمن میں امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن حسنؒ فرماتے ہیں: "فرماں روائے مملکتِ اسلامی کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ صدقات و زکوٰۃ کے اموال کو ان کے مصارف میں خرچ کرتے ہوئے خوفِ خدا کا دامن تھامے رہے اور ہر فقیر کو صدقات میں سے اس کا حق ادا کرے یہاں تک کہ فقیر اور اس کے اہل و عیال کو غنی کر دے۔"

اگر بعض مسلمان محتاج ہوں اور بیت المال میں صدقات وغیرہ کچھ نہ ہوں تو مسلمان حکمران خراج کے بیت المال سے اُن کی ضرورت پوری کر سکتا ہے اور یہ صدقات کے بیت المال پر کوئی قرض نہیں ہوگا، اس لیے کہ ہم گذشتہ صفحات میں واضح کر آئے ہیں کہ خراج وغیرہ مسلمان فقراء کی ضروریات پر خرچ کیا جاسکتا ہے لیکن اگر مسلمان حکمران کو فوج کی تنخواہیں وغیرہ دینے کی ضرورت پیش آئے اور خراج کے بیت المال میں کوئی مال نہ ہو تو وہ صدقات کے بیت المال سے تنخواہیں وغیرہ دے سکتا ہے، مگر تنخواہوں کی رقم خراج کے بیت المال کے ذمے قرض ہوگی، کیونکہ صدقات فقراء و مساکین کا حق ہیں۔ لہٰذا جب حکمران صدقات کے بیت المال سے کچھ رقم کسی دوسرے مصرف میں خرچ کرے گا تو یہ اُس بیت المال پر قرض ہوگی جس میں فقراء کا حق بھی شامل ہے یعنی خراج کا بیت المال۔ بیت المال ہی پر فقیر اور ضرورت مند کی احتیاجات کو پورا کرنے کا آخری ذریعہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب افرادِ اُمت کی مِلک ہے، امیر المومنین یا کسی خاص گروہِ انسانی کی مِلک نہیں ہے۔

شیخین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "میں ہر مسلمان کے لیے اُس کی اپنی ذات سے زیادہ رحیم و شفیق اور خیر خواہ ہوں۔ جو مسلمان کوئی مال چھوڑ کر مرے تو وہ اس کے ورثاء کے لیے ہوگا اور جو کوئی اس حالت میں مرے کہ اُس پر قرضہ ہو اور اس کے چھوٹے بچے ہوں جو بالکل بے زور و زر ہوں تو اُس کا قرضہ میں چکاؤں گا اور اس کے بچوں کی کفالت میرے ذمّے ہوگی۔"

مُسند احمد میں مالک بن اوس سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مندرجہ ذیل تین باتیں قسم کھا کر

بیان کیا کرتے تھے:۔

۱۔ بخدا! کوئی شخص اس مال (غنیمت اور مصالح عامہ کے لیے وقف مال) کا کسی دوسرے کی نسبت زیادہ حقدار نہیں ہے اور نہ میں کسی کی نسبت زیادہ حقدار ہوں۔

۲۔ بخدا! کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کا اِس مال میں حصّہ نہ ہو۔

۳۔ بخدا! اگر مَیں زندہ رہا تو میں جَبلِ صَنعاء کے چرواہے کو اس مال میں سے اس کا حصّہ ضرور دُونگا درآنحالیکہ وہ اپنی جگہ گلہ بانی کر رہا ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ حدیث، جیسا کہ امام شوکانی نَیل الاَوطار میں فرماتے ہیں، اِس بات کی دلیل ہے کہ امیرالمومنین عام افرادِ اُمّت کی طرح ہوتا ہے۔ اُسے کسی دوسرے پر اس بات میں کوئی فضیلت نہیں کہ مالِ غنیمت وغیرہ میں سے اس کا حصّہ دوسروں سے پہلے اور زیادہ دیا جائے۔ اسی طرح یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اسلامی حکومت کے زیر سایہ ہر انسان خواہ وہ کسی بھی مرتبہ و مقام کا ہو، اجتماعی مال سے اپنے حق اور حاجت کے مطابق لازماً اپنا حصّہ حاصل کرے گا۔

یہ کفالت صرف اہلِ اسلام کے فقراء تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ غیر مسلم ذمّی جو اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ رہتے ہیں ان کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی طرح بیت المال سے مدد لے کر اپنی ضروریاتِ زندگی کو پُورا کریں۔ امام ابویُوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الخراج میں اُس معاہدے کا متن نقل کیا ہے جس پر حضرت خالد بن ولید کی عراق کے علاقہ حِیرَہ کے عیسائی باشندوں سے مصالحت ہوئی تھی۔ اس سیاسی دستاویز میں واضح طور پر یہ لکھا تھا کہ اُن لوگوں کو فقر و فاقہ، بیماری اور بڑھاپے کے خلاف تحفظ دیا جائے گا، اور اُس کے اخراجات مسلمانوں کے بیت المال کے ذمّے ہوں گے۔ تاریخ میں سوشل سکیورٹی کی یہ پہلی مثال ہے جو ایک فاتح قائد نے اُن لوگوں کو دی جو جنگ میں مقابلے کی تاب نہ لا کر صلح کے خواہاں تھے، اور فاتح کے دین کو قبول کرنے کے بجائے اپنے ہی دین پر قائم رہنا چاہتے تھے۔ معاہدے کے الفاظ خالد بن ولید کی زبانی سنیے:

"مَیں نے اہلِ حیرہ کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے کہ کوئی بوڑھا جو کوئی کام نہ کر سکتا ہو یا وہ کسی آفتِ ناگہانی کا شکار ہو گیا ہو یا امیر ہو کر غریب ہو گیا ہو اور اپنے اہلِ مذہب کے صدقہ و خیرات

پر اسکی گذر اوقات کا انحصار ہو، اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے اور مسلمانوں کے بیت المال سے اُسکی اور اس کے افرادِ خانہ کی کفالت کی جائے جب تک وہ دار الہجرت اور دار الاسلام میں مقیم رہیں لیکن اگر وہ اِن دونوں مقامات سے نکل کر کہیں اور چلے جائیں تو مسلمانوں پر اُن کے کنبوں کی کفالت واجب نہیں"۔

حضرت خالدؓ بن ولید نے یہ فیصلہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت میں کیا تھا۔ اُن کے ساتھ جو صحابہ اُس وقت جہاد میں شامل تھے انہوں نے حضرت خالدؓ سے اتفاق رائے کیا، پھر جب یہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو انہوں نے اور بڑے بڑے صحابہؓ نے اسے بحال رکھا اور کسی نے بھی اس کو رد نہیں کیا۔ ایسا عمل جو کسی صحابی سے انجام پائے اور جب دوسرے صحابہ کو اس کا علم ہو اور اُن میں سے کوئی بھی اس کی تردید نہ کرے تو بہت سے فقہاء کے نزدیک یہ اجماع ہے۔

خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد کا ایک واقعہ تاریخوں میں لکھا ہے جس میں آپؓ نے غیر مسلم رعایا کی معاشی کفالت کے بارے میں واضح طور پر اعلان فرمایا تھا۔ اس طرح اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کی کفالت ایک ایسی "سنّت" بن گئی جو آنے والے عادل خلفاء کے لیے قابلِ تقلید اور واجب الاتباع تھی۔ کیونکہ عادلانہ پالیسیوں اور شریعت کی روشنی میں بنائے ہوئے قوانین کی صورت میں خلفائے راشدین جو نقش بھی چھوڑ گئے ہیں وہ دینِ اسلام کا ایک حصّہ سمجھا جائے گا اور مسلمانوں پر یہ فرض ہوگا کہ وہ سُنّت خلفائے راشدین کو اسی طرح قابلِ اتباع سمجھیں جس طرح کہ سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ فرمانِ نبویؐ ہے:

ان من یعش منکم فسیریٰ اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المھدیین من بعدی۔ عضوا علیھا بالنواجذ (ابو داؤد، ترمذی)	بیشک جو تم میں سے زندہ رہیں گے وہ بہت سے اختلافات رونما ہوتے دیکھیں گے۔ اس وقت تم پر یہ لازم ہے کہ تم میری سُنّت اور میرے بعد راست رَو خلفائے راشدین کی سُنّت پر عمل کرو اور سختی سے اس پر کاربند رہو۔

خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز نے حاکمِ بصرہ عَدِی بن اَرطَاۃ کو ایک مکتوب لکھا تھا جس میں آپ نے

اُسے بعض فرائض کے بارے میں نصیحت کی کہ وہ اپنے علاقے میں اُن کی پاسداری کرے۔ آپؓ کا یہ مکتوب اپنی اہمیت کے پیشِ نظر بصرہ کے عوام کو پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ مکتوب کا متن یہ تھا:

"اپنی طرف سے اس بات کا خیال رکھو کہ کوئی ذمّی جو بوڑھا ہو گیا ہو، اس کے قویٰ مضمحل ہو گئے ہوں اور کوئی کام کرنے سے عاجز ہو تو مسلمانوں کے بیت المال سے اُسے وظیفہ دو۔ اس لیے کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ امیرالمومنین عمرؓ بن خطاب ایک ذمّی بوڑھے کے پاس سے گزرے جو دربدر سوال کر رہا تھا۔ آپؓ نے فرمایا: ہم نے تیرے ساتھ انصاف نہ کیا کہ تیری جوانی میں تجھ سے جزیہ لیتے رہے اور بڑھاپے میں تجھے بھلا دیا، پھر آپؓ نے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کا اتنا وظیفہ مقرر کیا جو اس کی اصلاحِ احوال کے لیے کافی تھا"۔

اگر اسلامی حکومت کے خزانۂ عامرہ کے مستقل وسائلِ آمدنی اتنے کم ہو جائیں کہ فقراء و مساکین کی کفالت نہ ہو سکے اور معاشرے کے افراد باہمی ہمدردی اور تعاون کے جذبے سے بھی اتنے سرشار نہ ہوں کہ بطورِ خود فقراء کی کفالت کریں، تو پھر دولتِ اسلامیہ کے حکمرانوں پر لازم ہے کہ وہ اغنیاء کے مالوں پر مزید ٹیکس لگا دیں جس سے فقراء کی اعانت کی جا سکے اور اُن کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری ہو سکیں۔ یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں حکومت کے فرائض بڑی حد تک ایجابی اور جامع ہیں۔ حکومت کے ذمّے صرف یہی نہیں ہے کہ وہ افراد کی آزادی اور اُن کی ذاتی ملکیت کی حفاظت کرے، اور ظلم و عدوان کا سدِّباب کر کے امن و سلامتی کی فضا پیدا کر دے۔ اسلامی حکومت کا یہ کام بھی نہیں ہے کہ اغنیاء کو بالکل آزاد اور ناداروں اور فقیروں کو قوانینِ قدرت کے رحم و کرم پر چھوڑ دے حتیٰ کہ وہ ان قوانین سے رُوگرداں ہو جائیں یا ہلاک ہو جائیں، جیسا کہ نظریۂ انفرادیت اور آزاد معیشت کے علم بردار آدم سمتھ وغیرہ کہتے ہیں کہ "حکومت کا اوّلین فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ زرداروں کو ناداروں سے بچائے"۔ معاشرہ کے افراد، جیسا کہ انفرادیت کے علمبردار کہتے ہیں، محض اقتصادی عناصر نہیں ہیں جو اقتصادی پیداوار اور منفعت کے رشتے کے سوا کسی رشتے میں منسلک نہ ہو سکیں۔ بلکہ اسلام کی نظر میں معاشرہ باہم دگر مربوط ایک کنبہ ہے جس کے افراد اور گروہوں کے تعلقات اقتصادی پیداوار کے تعلق سے گہرے اور قوی تر ہیں۔ اِن تعلقات کی بنیاد ایمان و اسلام ہے جو سب افرادِ معاشرہ کو ایک ہی مقصد سے وابستہ کر دیتا ہے پھر

اس ایک ہی مقصد سے وابستگی کی وجہ سے اُن میں عقیدہ وفکر، شعور و جذبات، نظام و قانون اور آغاز و انجام کی وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے معاشرے کو ایک جسم کہا ہے جس کا ہر عضو اور ہر خلیہ ایک دوسرے سے مربوط و منسلک ہے، ایک دوسرے کے لیے مددگار بھی ہے اور مستحقِ امداد بھی۔ ہر ایک دوسرے کے لیے مفید ہے، ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور متاثر بھی۔ اور حکومت جس کا سربراہ اسلام میں امیر المومنین کہلاتا ہے اس کی حیثیت اس جسمِ معاشرہ میں سر کی سی ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ وہ نظام ہے جو معاشرے کے افراد کے باہمی ربط و اتحاد کی محافظت و نگہداشت کرتا ہے تاکہ اس ربط و اتحاد کے ثمرات و نتائج سے سارا معاشرہ فائدہ اٹھائے۔

حکومت کی ذمہ داری صرف اس بات تک محدود نہیں کہ وہ ذاتی ملکیت افراد اور آزادیٔ فرد کو داخلی اور خارجی حملوں سے محفوظ رکھے بلکہ اس کی ذمہ داریوں کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ چنانچہ اسلام میں قوم کے امیر کو بالکل ایسا ہی سمجھا گیا ہے جیسا کسی کنبے کا باپ۔ یہی وجہ ہے کہ بخاری و مسلم کی روایت کردہ ایک حدیثِ نبویؐ میں اُن دونوں (قوم کے امیر اور کنبے کے باپ) کو ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیته فالامام راعٍ وھو مسئول عن رعیته و الرجل فی اھل بیته راعٍ وھو مسئول عن رعیته۔ (بخاری و مسلم)

تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور اپنی رعایا کے بارے میں جواب دِہ۔ امیرِ قوم راعی ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ اور جو شخص اپنی گھر والوں میں راعی کی حیثیت رکھتا ہو (باپ) وہ اپنی رعایا (کنبہ) کے متعلق جوابدہ ہے۔

جس طرح باپ کی ذمہ داری صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کی حفاظت کرے بلکہ وہ اُن کی کفالت، تربیت اور معروف طریقے سے اُن کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے اور اُن کے درمیان عدل و انصاف کو قائم رکھنے کے بارے میں بھی جوابدہ ہے، اسی طرح امیرِ قوم کو بھی اُن سب لوگوں کے بارے میں جوابدہی کرنی پڑے گی جنہیں اللہ تعالیٰ نے اُس کی رعایا بنایا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر عراق میں کوئی

خچر ٹھوکر کھا کر گر پڑے تو میں اپنے آپ کو اس حالت میں دیکھتا ہوں کہ قیامت کے دن خداوندِ ذوالجلال مجھ سے اس کے بارے میں پوچھے گا کہ میں نے اس خچر کے لیے راستے کو ہموار کیوں نہ کرایا؟"

البدایہ والنہایہ میں حافظ ابن کثیر نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے متعلق ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ اُن کی بیوی فاطمہ نے کہا "میں ایک روز اُن کے پاس گئی تو دیکھا کہ وہ اپنا رخسار اپنی ہتھیلی پر رکھ کر جائے نماز پر بیٹھے ہیں اور آنسو اُن کے دونوں رخساروں پر بہ رہے ہیں۔ میں نے کہا "آپ کو کیا ہوا؟" انہوں نے فرمایا "اے فاطمہ! اللہ تجھ پر رحم کرے! مجھ پر اس اُمّت کی امارت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ میں نے بھوکے فقیر، بےکس مریض، تن ڈھانکنے کے کپڑے سے محروم شخص، شکستہ خاطر یتیم، بے یار و مددگار بیوہ، آفت رسیدہ مظلوم، قیدی، مسافر، پیر فرتوت، کثیر العیال اور قلیل المال افراد اور اپنی مملکت کے اطراف و اکناف میں بسنے والے ایسے ہی بے شمار لوگوں کے بارے میں سوچا تو مجھے محسوس ہوا کہ اللہ عزوجل ان سب کے بارے میں قیامت کے روز مجھ سے باز پرس کرے گا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم مذکورۂ بالا تمام افراد کی طرف سے میرے خلاف استغاثہ کریں گے۔ مجھے یہ خوف لاحق ہو گیا کہ میں اس مقدمے میں اپنی صفائی پیش نہ کر سکوں گا۔ اس لیے مجھے اپنے آپ پر رحم آگیا اور میں رونے لگا۔"

جب لوگوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بیعت کی اور اُن کی خلافت قائم ہو گئی تو وہ گھر لوٹے اس حال میں کہ بڑے غمزدہ اور فکرمند تھے۔ ان کے غلام نے اُن سے کہا "کیا وجہ ہے کہ آپ اس طرح غمزدہ اور فکرمند ہیں حالانکہ یہ وقت غم والم اور رنج و فکر کا نہیں؟" انہوں نے جواب دیا "اللہ تجھ پر رحم کرے! میں کیوں غمزدہ اور فکرمند نہ ہوں جب کہ مشرق و مغرب میں رہنے والا امتِ مسلمہ کا ہر شخص مجھ سے یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ میرا حق ادا کرو، خواہ اُس نے اپنے حق کے بارے میں مجھے لکھا ہے یا نہیں؟"

اِس خلیفۂ راشد کا احساسِ ذمّہ داری ملاحظہ فرمائیے کہ وہ مشرق و مغرب میں رہنے والے ہر فردِ اُمّت کے بارے میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں جوابدہ سمجھتا ہے اور یہ احساس رکھتا ہے کہ ہر فردِ اُمّت کو، خاص طور پر ناداروں، کمزوروں، بیماروں، بوڑھوں، بیواؤں اور یتیموں کو اُن کا حق پہنچانا اس کا فرض ہے، خواہ وہ اپنے حق کا مطالبہ تحریری طور پر یا بالمشافہہ نہ بھی کریں۔

اسلامی حکومت کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ عدل و انصاف قائم کرے، خیر و صلاح کی دعوت دے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ اور یہ بات عدل و انصاف اور خیر و صلاح اور معروف کے منافی ہے کہ کمزور و نادار افراد بھوکے رہیں اور فقراء و مساکین خورد و نوش اور لباس و رہائش کی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہیں درآنحالیکہ معاشرے کے اغنیاء کے پاس کافی دولت بے مصرف پڑی ہو۔ اسلامی حکومت کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ فقر و فاقہ کے مسئلے سے نمٹنے اور فقراء کو خوشگوار زندگی کی ضمانت دینے کے لیے مختلف ذرائع و وسائل اختیار کرے تاکہ معاشرے میں باہمی کفالت کا مقصد حاصل ہو سکے۔ یہ ذرائع و وسائل زمان و مکان اور حالات کے مختلف ہونے سے مختلف ہو سکتے ہیں اور اُمّتِ اسلامیہ کے اصحابِ اقتدار اور اہلِ رائے کے لیے اجتہاد کی راہیں بھی کھلی ہیں۔ میں فقر و فاقہ کے مسئلے کو حل کرنے کے اُن طریقوں میں سے صرف ایک طریقہ بطور مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں اختیار کیے۔ انہوں نے مدینہ کے قریب "رَبذہ" نامی ایک قطعۂ زمین کو سرکاری ملکیت بنا دیا تاکہ مسلمانوں کے چوپائے اُس میں چریں۔ مگر آپؓ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ نے فقراء و مساکین اور کم آمدنی والے افرادِ اُمّت کا حق سب سے مقدم رکھا تاکہ وہ اُس مفت کی چراگاہ کو اپنی حیوانی دولت اور آمدنی میں اضافہ کا ذریعہ بنالیں اور حکومت سے کسی قسم کی اعانت و امداد نہ مانگیں۔ یہ مقصد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس حکم میں پوری طرح واضح ہے جو آپؓ نے اس چراگاہ کے نگران ہنی کو دیا تھا۔ آپؓ نے اُس سے فرمایا تھا "اے ہنی! لوگوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو اور مظلوم کی دُعا سے ڈرو کیونکہ وہ مستجاب ہے۔ اور تھوڑے اونٹوں اور تھوڑی بکریوں والوں کو چراگاہ میں داخلے کی اجازت دو اور ابنِ عفان اور ابنِ عوف کے چوپاؤں (یعنی اُمّت کے امیر لوگوں کے اونٹوں اور بھیڑ بکریوں) کو رہنے دو کیونکہ اگر ان کے مال مویشی ہلاک ہو گئے تو وہ اپنے دوسرے کھیتوں اور نخلستانوں کی طرف پلٹ جائیں گے (یعنی اُن کے پاس دوسری جائیداد اور ذرائع آمدنی ہیں) اور یہ مسکین (تھوڑے اونٹوں اور بکریوں کا مالک)، اگر اس کے مال مویشی ہلاک ہو گئے تو وہ اپنے بچّوں کو ساتھ لے کر میرے پاس آکر دہائی دیگا کہ اے امیرالمومنین! کیا میں ان بچّوں کو چھوڑ دوں؟ لہٰذا اس کو یہ گھاس پھونس مہیّا کرنا میرے لیے سیم و زر مہیّا کرنے سے آسان ہے"[1]۔

[1] کتاب الاموال، ابوعبید، ص ۲۹۹۔